www.bhatkallys.com

ابن انشا

ادبی رسائل کے پچیس سال

آج سے پچیس برس پہلے کے ادبی رسالوں کا عجیب ہنجار تھا بلکہ اُس زمانے کے سارے ادب کا مزاج ہی آج سے بہت الگ تھا۔ یہ ادب میں حقیقت پسندی کی تحریک آنے سے پہلے کی بات ہے۔ خُدا نیاز فتح پُوری کا بھلا کرے جن کی بدولت اُردو میں ٹیگوریت اسکر وائلڈیت اور یونانی صنمیت کا ریلا آیا۔ انہی اثرات کی بدولت اُردو میں وہ عجیب و غریب صنف پیدا ہوئی جسے 'ادب لطیف' کہتے تھے۔ اب تو خیر مضمونوں اور تاریخوں تک میں اس کا ذکر نہیں ملتا لیکن ربع صدی پہلے کے لوگ اسی طرح اس پر ہزار جان سے عاشق تھے جس طرح آج غزل پر ہیں۔ اُردو۔ نگار اور معارف وغیرہ کے مزاج اور ظاہری ہیئت میں ان سالوں میں کچھ ایسا فرق نہیں آیا۔ اور اب سے پچیس برس بعد بھی مجھے یقین ہے ان کے قلبِ قالب کی ماہیت نہیں بدلے گی لیکن جو پرچے تخلیقی ادب کے لئے وقف رہے ہیں ان کا سراپا اکثر بدلا اور بہت بدلا۔ اس وقت ہمیں انہی سے غرض ہے۔

الہ آباد سے منشی کنہیا لال ایڈووکیٹ ایک ماہنامہ نکالتے تھے "چاند"۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ایڈیٹر نمبر نکالا۔ دراصل ان دنوں خاص نمبر نکالنے کا رواج بھی آج کی نسبت کہیں زیادہ تھا۔ عام رسالے سال میں چار چار خاص نمبر نکالتے تھے۔ خود ساقی کی بہت دنوں یہی روش رہی ہے۔ اپنی اشاعت کے دوسرے ہی سال اس نے بھی چار نمبر نکالے۔ سالگرہ نمبر ظریف نمبر۔ افسانہ نمبر۔ اور دلّی نمبر۔ جنہیں خُدا اور توفیق دیتا ہوگا وہ چار سے زیادہ بھی نکالتے ہوں گے۔ ارادہ ہونا چاہیئے نام اور بہانے ہزاروں۔ پشاور سے ایک پرچہ ادیب نکلتا تھا اس نے ۱۹۳۱ء میں خریداروں کو چار خاص نمبر، عید نمبر افسانہ نمبر۔ مزاحیہ نمبر۔ اور کابل نمبر مفت دینے کا اعلان کیا تھا۔ سالنامہ اور سالگرہ نمبران پر مستزاد تھے۔ نیرنگ خیال اور عالمگیر اُس زمانے میں بڑے جید پرچے سمجھے جاتے تھے اور نیرنگ خیال تو خیر اس سُنت شریفہ کا موجب ہی تھا۔ یہ بڑا جہازی سائز، نیلے پیلے حاشیے۔ بلا مبالغہ بیسیوں تصویریں۔ دو رنگی بھی اور سہ رنگی چہار رنگی بھی۔ آج کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ان تصویروں میں اور بیٹھے کے تھانوں پر سے اُتاری ہوئی رنگین تصویروں میں زیادہ فرق معلوم نہ ہوگا لیکن اُس زمانے کے لوگوں کا مزاج بھی رومانی اور یونانی قسم کا ادب پڑھتے پڑھتے عجیب میلوڈرامیٹک اور کلاسیکی سا ہوگیا تھا۔ غزلوں اور نظموں تک میں آہ کا لفظ بار بار آتا تھا۔ ادبِ لطیف تو آہ کے بغیر ایک سطر بھی نہ چلتا تھا۔ یہ کیفیت سنہ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء تک رہی اس کے بعد حقیقت پسندوں اور ترقی پسندوں نے ادب کا رُخ ہی بدل دیا۔ اور رسالوں کے اندازِ نظر میں بھی بلوغت آنے لگی۔

میں نے اُوپر چاند کے ایڈیٹر نمبر کا ذکر کیا تھا۔ یہ ایک بہت دلچسپ اور عجیب تالیف ہے۔ منشی کنہیا لال نے ہندوستان کا کوئی ایڈیٹر اور سابق ایڈیٹر نہ چھوڑا ہوگا، سب کے مضامین حاصل کئے (بعض مضمون آدھ آدھ بلکہ پاؤ پاؤ صفحے کے ہیں) اور سب کی تصویریں چھاپیں۔ یہ پکچر گیلری بجائے خود عبرت کا سامان ہے۔ آج کے بہت سے بڈھے اُس زمانے میں در خشنی جوان تھے اور اس زمانے کے بُڈھوں میں سے اکثر کو قبروں میں لیٹے مدتیں ہوئیں۔ فوٹو کھنچوانے کی خاطر ٹائی باندھنے یا بندھوانے کا رواج تو خیر اب بھی ہے اس وقت لوگ سینری دار پردے

www.bhatkallys.com

کے سامنے کھڑے ہو کر یا کتاب سامنے کھول کر یا کسی مکلف اسٹینڈ پر کہنی رکھ کر تصویر کھنچواتے تھے اور سارے زمانے کی علمیت چہرے پر یکمشت طاری کر لیتے تھے۔ ایک محترمہ تو ہاتھ میں پھول تک لئے کھڑی ہیں اور ایک صاحب نے سگریٹ اور فیلٹ کی مدد سے ای بلیموریا کی شکل اڑائی ہے۔ ستم ظریف ایڈیٹر نے نیچی مونچھوں والوں کو برابر برابر چھاپا ہے۔ مولوی عبدالحق، جوش ملسیانی اور شوکت تھانوی قریب قریب اس زمانے میں بھی ایسے ہی تھے جیسے اب ہیں، البتہ سید عابد علی، حفیظ جالندھری، سالک اور نیاز فتح پوری وغیرہ اب سے بہت مختلف تھے۔ ہمارے شاہد صاحب اس البم میں نہیں ہیں ممکن ہے اس زمانے میں بڑے ایڈیٹر نہ سمجھے جاتے ہوں۔ ان کی عمر بھی تو اس وقت چوبیس پچیس برس کی ہوگی۔

ساقی جنوری ۱۹۳۰ء میں نکلا۔ 'ادبی دنیا' عمر میں دو چار ماہ بڑا ہوگا۔ اس کے موسس اور ایڈیٹر مولانا تاجور مرحوم تھے۔ ہمایوں کو ان دنوں جوانا مرگ منصور احمد ایڈٹ کرتے تھے۔ مخزن غالباً دم توڑ چکا تھا۔ نیرنگِ خیال اور عالمگیر کا ہم پہلے ذکر چکے ہیں۔ بڑے بڑے اور اہم رسالے یہی تھے۔ اختر شیرانی کے خیالستان کو اور شامل کر لیجئے۔ لاہور کا 'رہنمائے تعلیم' بھی زوروں پر تھا اور محض تعلیمی پرچہ نہ تھا۔ زمانے کا ذکر بھی ضروری ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمانے میں زمانے کے ساتھ ساتھ اتنی تبدیلی نہیں آئی جتنی اور پرچوں میں آئی۔ شباب اردو کا ہر ورق نقرئی اور بھڑکیلا تھا لیکن اندر کچھ نہ رہ گیا تھا۔

غرض یہ ہے آج سے پچیس برس پہلے کے ادبی رسائل کی کیفیت۔ بعد میں ان میں سے کچھ پرچے ہلال شام سے بڑھ کے ماہ تمام ہو گئے جیسے 'ساقی'، 'ادبی دنیا' اور ہمایوں اور بعضے ہر برج میں گھٹتے گھٹتے صبح تک گمنام ہو گئے، ان میں نیرنگِ خیال اور عالمگیر وغیرہ آتے ہیں۔ پنجاب ہمیشہ سے ادبی رسائل کا مرکز رہا ہے ورنہ نکلنے کو دلی ہی نہیں اردو کے دوسرے مراکز پٹنہ اور حیدر آباد دکن وغیرہ سے بھی پرچے شائع ہوتے تھے۔ ساقی کا ڈھرا الگ رہا، پنجاب میں مسابقت بھی زیادہ رہی۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں ایک گروپ نے جو نیرنگِ خیال کی روح و رواں تھا کارواں کے نام سے ایک ہمہ رنگ فریں سالنامہ نکالا۔ اس کے ایڈیٹر مجید ملک تھے جو اب پاکستان کے پرنسپل انفرمیشن آفیسر ہیں۔ اس کا دوسرا سالنامہ ۱۹۳۴ء میں نکلا۔ اب کے ڈاکٹر تاثیر شریک ادارت تھے۔ جن لوگوں نے یہ دونوں سالنامے دیکھے ہیں وہ مانیں گے کہ اردو رسائل کے جلال و جمال کی روایت کو آگے بڑھانے میں کارواں نے کتنا بڑا حصہ لیا ہے۔ اس زمانے میں صوبائی بنیادوں پر ایک لسانی بحث بھی چل نکلی تھی جس میں ایک طرف غالباً ساقی اور اس کے مصنفین کا گروپ تھا اور دوسری طرف کچھ لوگ 'نیاز مندانِ لاہور' کے نام کے پیچھے مجتمع ہو گئے تھے، دونوں طرف سے خوب خوب چوٹیں رہیں، جو جتنی پُر لطف تھیں اتنی ہی افسوسناک بھی۔ کارواں غالباً نیرنگِ خیال کے خاص نمبر دل کا توڑ کرنے کے لئے نکالا گیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس کے بعد نیرنگِ خیال میں وہ بات نہ رہی اور وہ روز بروز گرتا گیا۔ غالباً سنہ ۱۹۳۶ء میں اس کا مشرق نمبر نکلا لیکن اتنے میں کچھ اور رسالے جوان ہو گئے تھے اور اب ادیب لوگ ان کے گرد جمع ہو چلے تھے۔ 'ادبی دنیا' تاجور مرحوم کو نقصان اٹھا کے بیچنا پڑا تھا۔ اب یہ آن صلاح الدین احمد کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے شریک کار ہمایوں کے سابق ایڈیٹر منصور احمد تھے لیکن فی الواقع اس کا زریں دور میراجی کی جوائنٹ ایڈیٹری کے وقت سے شروع ہوا اور قیام پاکستان تک رہا۔ مولانا صلاح الدین احمد نثری مضامین اور افسانوں کا جائزہ لیتے تھے اور اس زمانے کے افسانہ نگاروں کو ابھارنے میں جو بعد میں ادب بائے آسمان پر چاند اور سورج بن کر چمکے ان کا بڑا حصہ ہے۔ میراجی کی طبیعت میں اپج اور جدت پسندی کے ساتھ شعر کی تنقید کا عجب مذاق رچا ہوا تھا۔ انہوں نے 'ادبی دنیا' کے ذریعے اردو کو ایک نیا اسلوب تنقید دیا۔ 'ادبی دنیا' اپنے وقت کا

www.bhatkallys.com

سب سے سر برآوردہ پرچہ رہا ہے اور سات آٹھ برس تک تو اس کا یہ عالم رہا ہے کہ فائل میں دوسرے درجے کی کوئی تحریر شاید ہی ملے۔ یہ بات اتنے دعوے سے کسی اور پرچے کے متعلق نہیں کہی جا سکتی۔

مولانا تاجور مرحوم کی یہ کمزوری تھی کہ وہ پرچہ نکالے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ انہوں نے 'ادبی دنیا' کو بیچنے کے بعد 'شاہکار' نکالا۔ 'شاہکار' واقعی بڑی آب و تاب سے نکلا۔ سات رنگا ٹائیٹل ہوتا تھا۔ مضامین بھی اچھے خاصے ہوتے تھے۔ لیکن 'ساقی'، 'ادبی دنیا'، اور 'ادب لطیف' والی بات نہ تھی۔ دو چار برس بعد اس کا زوال شروع ہو گیا اور اسے بھی انہوں نے بیچ دیا۔ دراصل مولانا مرحوم کا مزاج اس زمانے کے مزاج سے ذرا الگ واقع ہوا تھا۔ وہ وقت کے نئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ اس دور کے ادیب موضوعی اور تکنیکی دونوں میدانوں میں باغی کہلانا فخر سمجھتے تھے اور تاجور صاحب ہر پرچے میں دو دو صفحے زبان کی غلطیوں پر صرف کرتے تھے۔

'عالمگیر' شبلی بی کام کی ادارت میں سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد تک بڑی شان سے نکلتا رہا۔ اس کا حلقۂ معاونین ذرا مختلف تھا۔ 'ساقی'، 'ادبی دنیا' اور 'ادب لطیف' کے علی الرغم اس پر نئے ادب کا رنگ نہ چڑھا تھا۔ مضامین میں تاریخی مذاق ہمیشہ غالب رہا۔ 'ادب لطیف' کے ایڈیٹر مرزا ادیب اس زمانے میں صحرا نورد کے خطوط کی بدولت مقبول ترین ادیبوں میں شمار ہونے لگے تھے اور 'ادب لطیف' والوں کا مکتبہ بھی نئے ادب کا قریب قریب سرکاری اشاعت گھر بن گیا تھا۔ پھر میرزا ادیب کے رخصت ہونے کے بعد اسے فیض، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور ساحر لدھیانوی جیسے ایڈیٹروں نے بہت کچھ سنوارا۔ اس نے بائیں بازو کے اثرات بھی دوسرے پرچوں کی نسبت زیادہ جذب کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 'ادب لطیف' اردو پرچوں کے لئے ماڈل بن گیا۔ جوش ملیح آبادی کا 'کلیم' غالباً سنہ ۱۹۳۶ء میں نکلا اور اس کے ذریعے جوش نے غزل اور روایتی شاعری کے خلاف خوب خوب لڑائیاں لڑیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سنہ ۱۹۳۵ء کے آخر میں وجود میں آئی تھی۔ دوسری جنگ سے کچھ قبل اس کا سرکاری ترجمان 'نیا ادب' شائع ہونا شروع ہوا۔ بعد ازاں 'کلیم' اور 'نیا ادب' ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ پھر صرف 'نیا ادب' زندہ رہ گیا۔ چونکہ دو پرچے بھی اتنے ہی ترقی پسند لیکن دلچسپی کا سامان زیادہ لئے ہوتے تھے اس لئے 'نیا ادب' کبھی ڈھنگ سے نہ چل پایا۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں یا اس کے لگ بھگ دلی سے شاہد احمد صاحب نے بھی ایک پرچہ نکالا تھا 'شاہجہاں' کے نام سے۔ وہ دلی کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرکاری ترجمانی کا مدعی تھا لیکن اکثر سرکاری ترجمانوں کا سا حشر اس کا بھی ہوا یعنی چل نہ پایا۔

'ہمایوں' بھی اب سے بارہ چودہ برس پہلے محض یادِ رفتہ کی حیثیت نہ رکھتا تھا بلکہ بڑے ٹھسے سے نکلتا تھا۔ اس کے بھی ایڈیٹر بدلتے رہے ہیں۔ تاجور تو خیر بہت پہلے یعنی سنہ ۱۹۲۱ء یا سنہ ۱۹۲۲ء میں رہے۔ جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں اس زمانے میں منصور احمد جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ بعد ازاں حامد علی خاں بہت برس رہے اور حقیقت یہ ہے کہ حامد علی خاں صاحب کی جوائنٹ ایڈیٹری کے دور میں 'ہمایوں' کو جو شان اور تمکنت نصیب ہوئی وہ اس سے پہلے اور بعد میسر نہ ہوئی۔ اس زمانے میں میاں بشیر احمد بھی آتش جواں تھے اور مالک ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی ایڈیٹر بھی تھے۔ حامد علی خاں صاحب کے جانے کے بعد یوسف ظفر، شیر محمد اختر اور مظہر انصاری اسے چلاتے رہے لیکن 'ہمایوں' کی وضعداری زمانے کا ساتھ نہ دے سکی۔ ناصر کاظمی نے آ کر چند جدتیں کیں لیکن معلوم ہوتا ہے یہ صبح دم بالائے بام آنے کی سی بات ہے۔

اس دور کے پرچوں میں 'شاعر' آگرہ کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ سیماب اکبر آبادی مرحوم اور ان کے "آگرہ اسکول" کا آرگن تھا اور اس میں بالعموم ان کے شاگردوں کا کلام چھپتا تھا پھر بھی اس کا حلقہ بہت وسیع تھا اور شاعری کے نکات کی تفہیم میں اس سے لوگوں کو بڑی مدد ملتی تھی۔

www.bhatkallys.com

بہت سے لوگوں نے شروع میں اس کے ذریعے شاعری سیکھی لیکن بعد میں ایسے باغی ہوئے کہ اس ذکر پر بھی محجوب ہوتے ہیں۔ یہ پرچہ آج کل بمبئی سے نکل رہا ہے لیکن اب اس کی حیثیت ہدایت نامہ شعرا کی سی نہیں عام ادبی پرچوں کی سی ہے۔

پچھلے سات آٹھ سال سے شائع ہونے والے رسالوں کا ذکر کرنے سے پہلے ہم پچھلے پچیس سال کے بعد ایڈیٹروں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اُس زمانے میں جن لوگوں نے ایڈیٹری کی دُنیا میں ہلچل پیدا کی اُن میں مولانا صلاح الدین احمد، مولانا حامد علی خاں اور شاہد احمد دہلوی کے نام بہت ممتاز ہیں۔ ان لوگوں نے اُردو کو ادیبوں کی ساری نئی نسل دی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ حکیم یوسف حسن صاحب (فی الحقیقت ان کے دوستوں تاثیر، مجید ملک وغیرہ وغیرہ) اور منصور احمد مرحوم کے نام آتے ہیں۔ میراجی بھی اس میدان میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ بعد کے ایڈیٹروں میں ادب لطیف کے میرزا ادیب کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کا ذکر ضروری ہے جو ادب لطیف کے کئی برس تک ایڈیٹر رہے، اور بعد میں سویرا اور نقوش کے موسس مدیر بنے جو اس وقت بھی اُردو کے چوٹی کے رسالے ہیں۔ سویرا، ادب لطیف کی پسلی سے نکلا تھا لیکن اجتہاد کا علم لئے اس کی بغاوتیں آگے چل کر دوسروں کی ادائیں بنیں۔ قطع کلام ہوتا ہے لیکن بات واضح کرنی ضروری ہے۔ ادیبوں کے ناموں کے لکھنے کے اوضاع سے لے کر مضامین کی ترتیب تک میں بہت تبدیلیاں ہوئی ہیں، کبھی نام مضمون کے نیچے لکھا جاتا تھا اب اُوپر لکھا جانے لگا۔ پھر سُرخی کے نیچے آگیا۔ کبھی داہنے کونے میں کبھی بائیں ہاتھ۔ عالمگیر تو سُرخی کے ساتھ بیل بوٹے بھی بناتا تھا اور توضیحاً "ایک اخلاقی نظم" "ایک علمی مقالہ" وغیرہ کی ذیلی سُرخی دیتا تھا تاکہ کہیں کچھ اور نہ سمجھ لیا جائے۔ ادیب بھی اپنے نام کے ساتھ القاب اور ڈگریاں دھوم دھام سے لکھتے ہیں۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے تو نام کے ساتھ لکھنے کا رواج ابھی حال تک رہا اور ہمایوں کو اس کا خاص لحاظ رہتا تھا لیکن لوگ اپنے عہدے اور پیشے تک لکھ دیتے تھے، مثلاً زاہد حسن بی۔ اے نائب تحصیلدار وغیرہ۔ پھر ایک زمانے میں قلمی ناموں کی اور پھر خوب صورت مرکب ناموں کی ریل پیل ہوئی، ترتیب میں نظموں، افسانوں اور مقالوں کے سکشن الگ کرنا اب ایک عام رواج ہے، لیکن میرے خیال میں اس کی ابتدا ۱۹۴۶ء میں سویرا نے کی۔ سویرا کا ہمارے ادب میں اب بھی بہت اُونچا مرتبہ ہے لیکن اس کی آغاز اشاعت کے وقت تو معیار اور حُسنِ ترتیب میں اس کا کوئی رقیب نہ تھا۔ پھر عسکری اور منٹو نے اردو ادب نکالا جو سیٹھ کی بہی کی طرح کھلتا تھا لیکن خدا جانے کیوں نہ چلا۔ اس کی دیکھا دیکھی اسی سائز پر جاوید نکلا۔ ریاض قادر اور ناصر کاظمی نے اوراقِ نَو کی صورت میں ایک صوری عیاشی کی۔ پرچہ بہت نفیس نکلا لیکن دیکھنے والوں نے شروع ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ صاحبزادے جوان ہوتے نظر نہیں آتے۔ میراجی نے بمبئی سے خیال نکالا تھا جس پر میراجیت کی گہری چھاپ تھی۔ بعد میں اختر الایمان بھی ادارت میں شریک ہوئے لیکن اس خیال کو میراجی سے بھی پہلے موت آگئی۔ لاہور سے انتظار حسین نے اسی نام سے پرچہ نکالا اور اس کی اُٹھان بڑی زبردست تھی لیکن اب اس سے تین شمارے اور ایک لطیفہ یادگار ہے اور بس۔ انتظار نے غالباً نقوش والوں کو جلانے کے لئے یہ فقرہ اشتہار میں لکھ دیا تھا کہ "خیال ایک ایسا پرچہ ہے جس کا ایڈیٹر بھی ہوگا۔ اور واقعی ادارت کے سلیقے کی وجہ سے ان کی بات ماننی پڑی لیکن مالک غالباً اس کمائی سے لاکھوں میں کھیلنا چاہتا تھا۔ پرچہ بند ہوا اور ایک دوست نے کہا کہ "خیال بند ہونے سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس پرچے کا ایڈیٹر کے علاوہ ایک مالک بھی تھا۔"
پشاور سے فارغ بخاری اور رضا ہمدانی بڑی ہمت سے "سنگِ میل" نکالتے رہے، اور اُنہوں نے بڑے اچھے عام اور خاص نمبر پیش کئے۔ اس پرچے کی اُفتادِ طبع بھی ترقی پسندی تھی۔ عارف عبد المتین نے ماہنامہ "ماحول" نکالا جو سالنامہ ہو کر رہ گیا ہے۔ "نقوش" غالباً اُردو کے پرچوں میں اب سب سے زیادہ مقبول ہے اور واقعی بڑے ٹھاٹ سے نکلتا ہے۔ ابتدا میں محمد طفیل کے علاوہ احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور ایڈیٹر تھے پھر کچھ ایسا پیچ پڑا کہ صرف محمد طفیل رہ گئے اور ادارت میں وقار عظیم کا نام اوپر آنے لگا وہ بھی گیا اور

www.bhatkallys.com

ثبات صرف محمد طفیل کے حصے میں آیا۔ اتنا اچھا پرچہ نکالنا اتنی بڑی خوبی کی بات نہیں لیکن اسے باقاعدہ نکالنا بڑی بات ہے۔ ممتاز شیریں اور صمد شاہین کے "نیا دور" کا تذکرہ اس سے پہلے آنا چاہیئے تھا۔ یہ پرچہ ۱۹۳۶ء میں بنگلور سے نکلا۔ اور پنگوئن نیو رائیٹنگ کے ماڈل پر تھا۔ انہوں نے بہت جلد اردو کے بیشتر اچھے ادیبوں کو دامن میں سمیٹ لیا۔ اس وقت اس کی روش سرکاری ترقی پسند تحریک سے چنداں الگ نہ تھی لیکن کراچی منتقل ہونے کے بعد کچھ ترقی پسند آگے بڑھے اور کچھ "نیا دور" کے ایڈیٹر پیچھے ہٹے۔ نہ صرف فصل پیدا ہوا بلکہ خاصی ٹھن بھی گئی۔ وہ انہیں رجعت پسند کہتے تھے اور انہیں ان کی پاکستانیت کے متعلق شکوک تھے۔ کراچی میں آنے کے بعد پہلے سی باقاعدگی بھی اشاعت میں نہ رہی اور غالباً ۱۹۵۲ء میں یہ پرچہ بھی مرحوم ہوا۔ اس کے جتنے نمبر نکلے خوب نکلے۔ اس کی مقبولیت میں ممتاز شیریں کے سالانہ ادبی جائزوں کا خاص دخل تھا۔

دکن ہمیشہ سے اردو کا ایک اہم مرکز رہا ہے اور حیدرآباد سے متعدد ادبی رسالے نکلتے رہے ہیں اور اب بھی نکلتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک دو کے سوا کوئی معیار اور شان میں شمالی ہند کے رسالوں کی برابری کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ "سب رس" حیدرآباد کے پرانے پرچوں میں سے ہے اور اس نے مختلف مدیروں کے زمانے میں مختلف رنگ بدلے ہیں۔ آج کل یہ نجمہ سمیع اور سلیمان ادیب وغیرہ کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے اور رجحان کے اعتبار سے ترقی پسند ہے۔ اگرچہ اس کے مضمون نگاروں کا دائرہ اب بھی بڑی حد تک مقامی ہے تاہم اب یہ ترقی کر رہا ہے اور اس کے خاص نمبر تو بالخصوص خاصے وقیع ہوتے ہیں۔

تقسیم کے بعد "نگار" بھی بھوپال سے کراچی آ گیا اور اب تک صہبا لکھنوی کی ادارت میں کامیابی سے نکل رہا ہے۔ کراچی کے پرچوں میں اختر انصاری اکبرآبادی کا "مشرب" بھی ترقی کر رہا ہے اور اسے اچھے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے۔

"نوائے وقت" کے ایڈیٹر حمید نظامی اب مشہور صحافی ہیں ایک زمانے میں مشہور ادیب تھے۔ انہوں نے ۱۹۴۹ء میں "مخزن" کو زندہ کیا اور ادارت کے لئے حامد علی خاں کو بلایا۔ افسوس یہ پرچہ چل نہ سکا اور اب تو یہ نظر آتا ہے کہ اس نام کا پرچہ کبھی نہ چلے گا۔ حامد علی خاں نے "الحمرا" نکالا۔ اس کا کردار عام ادبی پرچوں سے الگ ہے اس میں آج کا رنگ کم ہے آج سے بیس برس پہلے کا انداز زیادہ۔ ساقی کی طرح اس کی فہرست مضامین بھی سکہ بند ہو چکی ہے اور بعض نام صرف یہیں نظر آتے ہیں۔ اس پر سنجیدگی اور علمیت کا زیادہ غلبہ ہے جو مبارک ہے لیکن کبھی کبھی یہ کہنگی اور فرسودگی کے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ بہر حال اس کا حلقہ الگ ہے۔ "عندلیب" شادانی کا "دور" (ڈھاکہ) بھی علمی شان کا ماہنامہ تھا غالباً بے قدری کی وجہ سے بند ہو گیا۔

جنگ کے دنوں میں حکومت ہند نے دہلی سے ایک نیم ادبی نیم سیاسی پندرہ روزہ پرچہ "آج کل" کے نام سے نکالا تھا پہلے یعقوب دواشی اس کے ایڈیٹر تھے پھر وقار عظیم صاحب آ گئے۔ اس کا معیار خاصا اچھا تھا اور یہ اپنی صوری خوبیوں اور کم قیمتی کی وجہ سے مقبول بھی بہت ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی سے حکومت نے "ماہ نو" کے نام سے جو ماہنامہ وقار عظیم صاحب ہی کی ادارت میں نکالا اس کا شروع میں تو خیر آج کل ہی کا سا ہنجار تھا لیکن بعد میں ادبی اور علمی رنگ زیادہ چڑھا اور روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔ وقار عظیم کے بعد کچھ دنوں محمد حسن عسکری اس کے ایڈیٹر رہے پھر رفیق خاور ہوئے پرچہ خوب صورت ہوتا ہے اور سرکاری پرچہ ہونے کی وجہ سے اچھے ادیبوں کے اچھے مضامین حاصل کرنے میں اسے زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ گزشتہ سال سے کراچی سے آرٹ پیپر پر "سیارہ" نام کا ایک رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے یہ بڑی حد تک ادبی ہے اور اب آگے تو جلال و جمال دونوں اعتبار سے پہلے سے کہیں زیادہ ترقی کر گیا ہے۔ ادارے میں محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے نام ہیں۔ اگر یہ پرچہ محض ذہنی عیاشی نہیں اور اپنا خرچ نکال سکتا ہے تو دوسرے رسائل کے لئے نشان راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ (بقیہ صفحہ ۱۶۵ پر)

www.bhatkallys.com

پائے کے اہلِ علم کی جو چیزیں اس ادارے میں شائع ہوئیں وہ اتنی دقیق اور قابلِ قدر ہیں جن سے بچے تو بچے۔ بڑے بڑے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

مکتبہ جامعہ ہی کی دیکھا دیکھی انفرادی کوششیں جاری ہوئیں جن کا سلسلہ تا حال جاری ہے اور یوں بہتیری چیزیں بھی ہم کو ملیں۔ اگرچہ رطب و یابس کی بہتات بھی سہائی رہتی ہے۔ تجارتی فوائد کو دیکھ دیکھ بہتیرے غلط افراد کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور بچوں کے ادب پر بھی ہاتھ صاف کیا گیا۔ کراچی میں جب میں نے اپنے "اردو گھر" (اشاعت خانہ) کی تجدید کی اور بابائے اردو مدظلہٗ سے اس کا افتتاح کرایا تو آں مخدوم کو سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے توجہ دلائی کہ بچوں کے ادب پر "آکے عجب وقت پڑا ہے" انئی تانتی کی تربیت یونہی ناقص ناقص ہو رہی ہے' بچے تو بچے بڑوں کے اخلاق و آداب اور عام اخلاقی اقدار خاک بسر ہو رہے ہیں' اس عام بدحالی میں بچوں کا جو ادب سامنے آ رہا ہے' اُسے دیکھ دیکھ دل ہول کھاتا ہے روک تھام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ بابائے اردو مدظلہٗ نے اپنی جوابی تقریر میں جو کلماتِ خیر ارشاد فرمائے اُن کے آخر میں خصوصیت سے یہ بات واضح فرمائی۔ آں مخدوم نے اس موقع پر جو کچھ فرمایا اُسی پر اپنی معروضات ختم کرنی چاہتا ہوں۔ پھر کبھی موقع ملا تو انشاءاللہ جن پہلوؤں کا تذکرہ پیش نظر ہے پیشِ خدمت ہوں گے۔ سردست معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ تو بس برادرِ محترم شاہد احمد صاحب مکرم کی تعمیلِ حکم ہے کہ اسی بہانے دلی شریف کا حق نمک' بُرا بھلا شاید ادا سمجھا جائے یوں چھوٹا سا یہ مضمون کیا' پریشان نویسی کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ہاں تو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہٗ فرماتے ہیں:۔

"بچوں کی تعلیم ہماری قومی زندگی کا بہت اہم جزو ہے بچپن میں جو اچھی بُری باتیں کان میں پڑتی یا پڑھنے میں آتی ہیں وہ دل میں گھر کر لیتی ہیں' اُن کا اثر اور عمل مرتے دم تک قائم رہتا ہے۔ اس لئے یہ ٹھیک ہے کہ بچوں کا ادب تیار کرنے میں پوری احتیاط' ذہانت اور سلیقے سے کام لینا ضروری ہے

ادبی رسائل کے پچیس سال (بسلسلہ صفحہ ۱۳۳)

اب ہم ہندوستان کے ایک دو پرچوں کا ذکر کریں گے۔ ساحر لدھیانوی نے سنہ ۱۹۴۸ء میں دلی سے 'شاہراہ' نکالا' خود تو وہ حسبِ عادت اس کے چند شمارے بڑے ٹھاٹ سے نکال کے بمبئی چلے گئے بعد میں پرکاش پنڈت اسے کئی برس تک ترقی پسند مصنفین کے نیم سرکاری آرگن کے طور پر کامیابی سے چلاتے رہے۔ آخر میں وہ 'شاہراہ' سے رخصت ہو کر دوماہی 'فنکار' کے ایڈیٹر ہوئے اور 'شاہراہ' نے ایک سال میں چار ایڈیٹر بدلے۔ پہلے مخمور جالندھری آئے پھر واثق آہوزی اب ظ الفاری ہیں اور انہوں نے اس میں بعض طباعتی جدتیں پیدا کی ہیں۔ 'فنکار' دوماہی بڑا ہونہار ہے لیکن 'سویرا' کی طرح بے قاعدگی کا روگ اس کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔

ان پچیس ۲۵ برس میں دُنیا بدل گئی۔ اگر ہمارے جائزے کے سال اوّل کے بہترین نمائندہ پرچے نیرنگِ خیال' ساقی اور عالمگیر وغیرہ تھے تو آج یہ پدوی سویرا۔ نقوش اور فنکار وغیرہ کو حاصل ہے۔ کل خدا جانے کیا رنگ ہو۔ اس مختصر اور نامکمل جائزے سے اگر ایک اجمالی تصویر (کچھ دھندلی سی ہی کیوں نہ ہو) اسکیچ بھی قاری کی نظر کے سامنے آ جائے تو بہت ہے ورنہ اگر واقعی اس زمانے کے سارے پرچوں کے فائل سامنے رکھ کے بالاستیعاب جائزہ لکھا جائے تو ایک کتاب پر محیط ہو سکتا ہے۔ پھر ہم نے ہفت روزہ ادبی پرچوں کو لیا ہی نہیں نہ علمی پرچوں کے متعلق تفصیل سے کچھ لکھا ہے۔ ادیبوں کا کون سا کارواں کب آیا۔ کس طرح آیا اور کب گزر گیا' اس کی حکایت بھی لذیذ لیکن بہت دراز ہے۔ — یہ ہے کہ ہر پرچہ کی تاریخ الگ لکھی جائے اور تفصیل اس میں آ جائے' اس وقت تو یہ احساس ہو رہا ہے کہ تھوڑا سمیٹا گیا ہے اور بہت رہ گیا ہے' بہرحال آپ بھی زندہ ہیں اور ساقی بھی اور خدا نے چاہا تو ہم بھی۔

بازاری اور معنوی لحاظ سے سستی کتابوں سے بچوں کو بچانا چاہئے بچوں کے لئے اچھی کتابوں کی ابھی تک بہت کمی ہے"

(قومی زبان۔ یکم فروری سنہ ۵۵ء)